سہراب سپہری اور مجید امجد کی شاعری میں فطرت نگاری کا مطالعہ

علی کاوسی نژاد

Abstract:

These days we find a growing tendency of comparative studies in Urdu and Persian Literature; thus there are a number of poets in Urdu and Persian who can be subjected to comparative studies. Poetry of Sohrab Sepehri and Majeed Amjad has a lot in common, such as love for nature that can be seen in the poetic works of both the poets. If Sohrab Sepehri closely relates himself to the city of Kashan and it's natural landscape, Majeed Amjad too is fond of rural beauty. Both the poets have an unsurpassable affection for the nature and it's relative phenomena. Both the poets are fond of natural environment and show a certain degree of dislike for mechanical age. In this study we'll be discussing the importance of naturalism in the poetry of the said poets.

Keywords:

Sohrab Sepehri, Majeed Amjad, Camparative Literature, Nature, N.M. Rashid.

آج کل کی دنیا میں تقابلی ادب کا رجحان بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اس ضمن میں اردو فارسی شاعروں اور تخلیق کاروں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بیسویں صدی اردو فارسی ادب کی تاریخ میں اہمیت کی حامل رہی ہے جس زمانے میں اردو نظم نگاری کی ہیئت اور موضوعات میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ن۔ م راشد اور میرا جی جیسے نظم نگاروں نے نئے نئے موضوعات کو اردو نظم نگاری کا حصہ بنا دیا وہاں فارسی شعر و ادب میں روایتی شاعری سے ہمیں روگردانی نظر آتی ہے۔ نیما یوشیج جو فارسی نظم نو کے بانی سمجھے جاتے ہیں انہوں نے غزل اور کلاسیکی شاعری کی ہیئت اور موضوعات میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور دوسرے بہت نظم گو شاعروں نے بھی نیما کے نقش قدم کو مشعلِ راہ بنایا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ جس زمانے میں فارسی نظم گوئی میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں اس وقت ن-م-راشد اقوام متحدہ کی طرف سے ایران میں بطور افسر تعلقات عامہ تھے اور انھوں نے ایران کے نظم گو شاعروں سے ملاقاتیں کیں اور رفتہ رفتہ ان کی فارسی نظموں کو اردو کے سانچے میں ڈھالا۔ راشد چونکہ خود شاعر تھے اور نظم گوئی کی نزاکت اور باریکیوں سے بخوبی واقف تھے اس لیے انھوں نے بائیس فارسی نظم گو شاعروں کی اسّی نظموں کا اردو منظوم ترجمہ کیا۔ انھوں نے اپنے منظوم تراجم کو جدید فارسی شاعری کا نام دیا۔ یہ تراجم نیما یوشیج سے لے کر احمد رضا احمدی تک کے نظم گو شاعروں کی نظموں پر مبنی ہیں۔ اس میں ن م راشد نے سہراب سپہری کی چار نظموں کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

جب ہم مجید امجد اور سہراب سپہری کی نظم نگاری کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو دنوں کی نظم نگاری میں ہمیں مماثلت نظر آتی ہیں۔ سہراب سپہری ایک نقاش نظم گو شاعر ہیں جو اپنی مادری زبان کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے اور عرصہ دراز تک یورپ کی فضا میں رہے۔ اس کے علاوہ سہراب نے مشرقی ممالک جیسے انڈیا، پاکستان، جاپان اور افغانستان کا بھی سفر کیا۔ سہراب نے اپنی زندگی میں سنہ 1961، اور سنہ 1963 میں انڈیا کا سفر کیا اور اس سفر کے دوران ممبئی، بنارس، دلّی، آگرا اور کشمیر کی سیر کی۔ بدھ مت کے فلسفے نے سہراب پر اپنے بہت اثرات چھوڑے اور یہ سب کچھ ان کی نظم گوئی میں صاف نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سنہ 1963ء میں پاکستان کا سفر کرتے ہوئے کراچی اور پشاور میں اقامت اختیار کی۔[۱]

سہراب سپہری اور مجید امجد کی نظم گوئی میں ممتاز اور انفرادی خصوصیات نظر آتی ہیں۔ فطرت نگاری اور فطرت کی عکاسی ان دنوں سربرآوردہ نظم گو شاعروں کے ہاں ہمیں زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مجید امجد اور سہراب سپہری کے یہاں فطرت نگاری کا تجزیاتی مطالعہ کریں، ان دنوں کی ذاتی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ جس طرح سیگمنڈ فرائیڈ نے انسانی زندگی کی تمام الجھنوں کو انسان کی اندرونی خواہشات سے وابستہ کیا ہے اسی طرح شاعروں کی ذاتی زندگی میں ایسی بہت سی خصوصیات موجود ہیں جن کی بنا پر وہ شاعری اور فطرت کے سائے میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سہراب سپہری کی پرورش ایک امیر خاندان میں ہوئی جن کو زندگی کی ہر آسائش و راحت مہیا تھی اور وہ اپنی خداداد صلاحیت کے بل بوتے پر ایران کے ایک معروف و مشہور مصور اور نظم گو شاعر کے طور پر ابھرے۔ اس شہرت کا سارا دار و مدار ان کی اپنی ذہانت اور دانائی پر مشتمل ہے۔ سہراب سپہری نے پوری زندگی شادی نہیں کی اور کسی محبوبہ سے ان کی عشق و محبت کی کہانی کبھی سامنے نہیں آئی۔ وہ ایک کم آمیز شخص تھے اور سرکاری ملازمت سے ہر وقت گریزاں نظر آتے ہیں۔ انھیں مصوری سے خوب لگاؤ تھا اس لیے انہوں نے کبھی یورپ کا رخ کیا اور مصوری کی بین الاقوامی نمائشوں میں اپنی مصوری کے کام کی نمائش کروائی اور کبھی بدھ مت کے فلسفے سے متاثر ہو کر جاپان، ہندوستان، پاکستان اور افغانستان کا سفر کیا۔ ن م راشد، سپہری کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''سپہری کے فکر پر مشرقی (خاص طور پر ہندو اور بودھ) فلسفے کا گہرا اثر پڑا ہے اور اسلوب بیان

میں جاپانی اور چینی شاعری کا پرتو تلاش کرنا آسان ہے۔ سپہری کا رشتہ دوسرے جدید شاعروں کے مقابلے میں نیما سے قریب تر ہے۔ نیما کی طرح اس نے زندگی کے حسن، لطافت اور پاکیزگی کی حمد کہی ہے۔ سپہری کی شاعری میں وہ پراگندگی اور تضاد نہیں جو کئی اور جدید شاعروں کے کلام میں ملتا ہے۔ اس کی شاعری زندگی کی گہرائیوں اور وسعتوں کی خبر لاتی ہے۔ وہ زندگی کی سادہ حقیقتوں کے بیان کے ذریعے بعض دفعہ ماورا الطبیعی افکار و خیالات کی تخلیق کرتا ہے۔''[۲]

سہراب ہمیشہ اپنے شہر کاشان سے لگاؤ رکھتے تھے اور ان کی نظم " صدای پای آب" اس بات کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کی تمام نظمیں ہشت کتاب کے نام سے شائع ہو چکی ہیں جس میں ان کے شعری مجموعے مرگ رنگ، زندگی خواب ہا، آورا آفتاب، شرق اندوہ، صدای پای آب، مسافر، حجم سبز، ما ہیچ مانگاہ شامل ہیں۔ ان کی طویل نظم " صدای پای آب" زیادہ شہرت حاصل کر چکی ہے۔

جب ہم مجید امجد کی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ ایسے شخص کے طور پر سامنے آتے ہیں جو بچپن سے ہی مہر پدری سے محروم نظر آتے ہیں جن کی پرورش ان کے نانا اور ماموں کی نگرانی میں ہوئی۔ ان کے نانا نور محمد اور ان کے ماموں منظور علی فوقؔ عالم اور فارسی شاعر تھے اور ان کی صحبت میں رہ کر مجید امجد نے اردو اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی میں مہارت حاصل کی۔ مجید امجد کی ازدواجی زندگی ناکام رہی اور وہ ہمیشہ کے لیے اولاد کی نعمت سے محروم رہے اور زندگی کے آخری دن بھی کس مپرسی اور افلاس میں بسر کیے۔ انسان ہمیشہ اپنی ذاتی زندگی میں خاص محرومیوں کا شکار رہتا ہے۔ سہراب اور مجید امجد بھی اپنی محرومیوں سے فرار کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اس کی صدائے بازگشت ان کی نظم نگاری میں ہمیں سنائی دیتی ہے۔

سہراب سپہری جو فن مصوری کے دلدادہ ہیں ماحول اور قدرتی مناظر، نیز ماحول کی ہر اس چیز پر گہری نظر رکھتے ہیں جس میں اللہ تعالی کے آثار اور نشانات موجود ہوں۔ دوسرے لفظوں میں سہراب وحدت الشہودی فلسفے کے قائل نظر آتے ہیں جو ہر وقت بے جان اور جاندار اشیا کے وجود میں اپنے حقیقی رب کے متلاشی ہیں اور یہ ان کے ہاں ایک خاص فلسفے اور نظریے کے طور پر زندہ دکھائی دیتا ہے۔ سپہری کی نظم گوئی کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر لحہ فطرت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں جان بخشی کی کیفیت (Personification) پیدا کر دیتے ہیں، جس میں بے جان اشیا بولنے لگتی ہیں اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو سپہری کی نظم گوئی کو دوسرے ایرانی نظم گو شعرا سے الگ کر دیتی ہے۔ ان کے ہاں خاص انفرادیت نظر آتی ہے۔ درخت، پرندہ، پتھر، پھول، پھل، کلی، پتھر اور تتلی ان کی نظموں میں زندہ کردار کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس کی اچھی مثال ''خواب تلخ'' میں نظر آتی ہے۔

مرغ مہتاب می خواند
ابری در اتاقم می گرید
گل ہای چشم پشیمانی می شکفد

در تابوت پنجرہ ام پیکر مشرق می لولد
مغرب جان می کند،
می میرد [۳]

اردو ترجمہ:

چاند کا پرندہ چہچہاتا ہے
میرے کمرے میں کوئی بادل روتا ہے
پشیمانی کی آنکھوں کے پھول کھلتے ہیں
میری کھڑکی کے تابوت میں مشرق کا پیکر گھومتا ہے
شام جان دے رہی ہے
مر رہی ہے

سہراب سپہری بے جان اور جامد اشیاء میں جان بخشی کی خوبصورت کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ ان کا فلسفہ ہے جس میں وہ ہر وقت منہمک نظر آتے ہیں۔ کبھی ان کے ہاں چاند کا پرندہ چہچہاتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی بادل ان کے چھوٹے کمرے میں اچانک رونے لگتا ہے اور شام جان دہی کی کیفیت میں مبتلا نظر آتی ہے۔ یہ وہ حالت اور کیفیت ہے جو سہراب سپہری کی نظم نگاری کی سب سے اہم نمایاں خصوصیت ہے جسے جان بخشی کی شعری صنعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت سہراب کے ذہنی اور نظریاتی اصولوں کا نتیجہ ہے جو ہر چیز میں اسے خدا نظر آتا ہے۔ بے جان اشیاء یکدم بولنے، چہکنے لگتی ہیں اور ان میں انسان جیسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں اور حواس خمسہ کی نشانیاں ان میں نمودار ہوتی ہیں۔

سہراب خود ایک مصور ہیں اور اردگرد کی دنیا پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ فطرت میں گھومنے اور اس کے رگ و پے سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ فطرت کی ہر چیز سے انھیں محبت ہے۔ وہ قدرتی ماحول سے مانوس ہو کر اسے اپنانے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔

مجید امجد جب دو برس کے تھے ان کے والدین میں علیحدگی ہوئی اور ان کی پرورش ان کے ننھیال میں ہوئی۔ وہ اپنے نانا مولوی نور محمد اور ماموں منظور علی فوق جو دونوں شاعر تھے، سے زیادہ متاثر رہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مجید امجد مہر پدری سے محروم رہے اور بعد میں انھیں ازدواجی زندگی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اپنی خالہ کی بیٹی سے شادی کی لیکن ان کے آپس میں نہ بن پائی اور وہ ایک دوسرے سے الگ رہتے تھے۔ اس کے علاوہ مجید امجد اولاد کی نعمت سے بھی محروم رہے۔ ایک جرمن لڑکی شالاط سے انھیں محبت ہوئی لیکن مجید امجد، شالاط کو اپنانے میں بھی پورے طور پر ناکام رہے۔

مجید امجد چونکہ محکمۂ خوراک سے وابستہ رہے اس لیے انھیں پنجاب کے کئی علاقوں میں رہنے اور فطری ماحول کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں انھوں نے بی۔ اے کر کے پھر جھنگ اور ساہیوال کا رخ

کیا اور گاؤں کی خوبصورت فضا میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ شاید وہ شہری زندگی سے گریزاں تھے اس لیے مجید امجد نے یہ مناسب سمجھا کہ فطری ماحول کو اپنا مستقل بسیرا بنا لیں۔ مجید امجد کی شاعری میں فطرت نگاری کی خصوصیت نظر آتی ہے اور ہر وقت فطرت سے قریب رہنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت سہراب سپہری کے ہاں بہت اعلیٰ درجے کی ملتی ہے اور سہراب کے ہاں ایک خاص فلسفہ بن کے سامنے آتی ہے۔

سہراب کو اپنے شہر " کاشان" سے بے حد محبت ہے اور وہ اس سے قریب رہنے کی بھی خواہش رکھتا ہے لیکن مجید امجد نے اپنی اہلیہ سے عدم مفاہمت کی بنا پر اور ازدواجی زندگی میں ناکامی کی وجہ سے جھنگ کو چھوڑ کر ساہیوال میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس ضمن میں دونوں نظم گو شاعر اپنی جائے پیدائش کے بارے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اس میں بخوبی ہم پر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ سہراب کو " کاشان" سے بے حد لگاؤ ہے اس کے بالکل برعکس مجید امجد محرومیوں کے سبب ''جھنگ'' سے دور رہنے کا خیال پیش کرتے ہوئے اس کی مذمت پر اترتے ہیں۔

یہاں کلید حقیقت نہیں کسی کے پاس یہاں کے تحفے حسد اور عداوت اور افلاس
یہاں ارادہ و ہمت کی وسعتیں محدود یہاں عروج و ترقی کے راستے مسدود
ہر اک بشر ہے یہاں تنگدستیوں کے قریب بلندیوں سے بہت دور، پستیوں کے قریب [۴]

مجید امجد کو اپنی جنم بھومی سے اتنی محبت اور لگاؤ نہیں جتنی سہراب کو کاشان سے ہے۔ امجد کو جھنگ کی حسد، عداوت اور افلاس زدہ ماحول سے سخت نفرت ہے اور اپنی ترقی کے تمام راستے بند پا کر ساہیوال میں مستقل طور پر اقامت کرنے لگتے ہیں جہاں وہ عمر کے آخری لمحات کو بڑی کس مپرسی کے عالم میں گزار کر اس فانی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس سہراب اپنی نظم " صدای پای آب" میں کاشان کا ذکر بڑی خوبصورتی کے ساتھ آتا ہے:

اہل کاشانم
روزگارم بد نیست
تکہ نانی دارم، خردہ ہوشی، سر سوزن ذوقی
مادری دارم، بہ تر از برگ درخت
دوستانی، بہ تر از آب روان [۵]

اردو ترجمہ:

کاشان کا رہنے والا ہوں
میری اچھی گذر بسر ہوتی ہے
روٹی کا ایک ٹکڑا ملتا ہے، ذرا سی ذہانت، تھوڑا سا ذوق رکھتا ہوں
ماں میری درخت کے پتوں سے بھی زیادہ پیاری
میرے دوست بہتے ہوئے پانی سے بھی زیادہ مہربان

سہراب اپنی نظم میں نہ صرف کاشان سے بے حد پیار کا اظہار کرتے ہیں بلکہ وہ گوشت و پوست کی زندہ چیز کا تقابل فطرت میں موجود اشیاء سے کرتے ہیں۔ اس کے ہاں درخت کے پتے اور پانی پاکی اور عطوفت کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں جو اپنے اندر خلوص، صدق وصفا کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ علامت نگاری کے ذریعے وہ ہر ایک شے کے وجود میں نیکی اور اچھائی کی تلاش میں ہے۔

مجید امجد اور سہراب سپہری کی شاعری میں ایک مشترکہ خصوصیت فطرت اور اس کی ہر چیز سے محبت کا اظہار ہے۔ دونوں کی نظموں میں پانی، بارش، پھول، درخت، پتھر، چاند، ستارہ، شام، تتلی وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ دو نظم گو شعرا اپنے اردگرد کے ماحول پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اور فطرت کی ہر چیز کو نئے نئے زاویے سے دیکھنے کے متلاشی ہیں۔ سہراب کے ہاں فطرت کے ذرات میں وحدت الشہودی فلسفہ نظر آتا ہے اور مظاہر فطرت یوں اس کی ہر نظم میں رواں دواں ہیں جیسے ہر ایک شے میں اسے خدا نظر آتا ہے۔ اس کی نظم ''صدای پای آب'' میں یہ کیفیت ہمیں بخوبی دکھائی دیتی ہے۔

من مسلمانم
قبلہ ام یک گل سرخ
جانمازم چشمہ، مہرم نور
دشت سجادہ من
من وضو با تپش پنجرہ ہا می گیرم
در نمازم جریان دارد ماہ، جریان دارد طیف
سنگ از پشت نمازم پیداست [۶]

اردو ترجمہ:

میں ایک مسلمان ہوں
میرا قبلہ گلاب کا ایک پھول ہے
چشمہ میرا مصلا ہے، روشنی میرا نماز کا نشان ہے
صحرا میرا مصلا ہے،
میں کھڑکیوں کی دھڑکنوں سے وضو کرتا ہوں
میری نماز میں چاند اور کرنیں وجود رکھتی ہیں
میری نماز میں بھی پتھر نمودار ہے

سہراب کس خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ فطرت کے مظاہر کو علامتی طور پر استعمال میں لاتے ہیں کہ اس کی نماز میں فطرت کی ہر شے نمودار ہے۔ ان کا قبلہ گلاب کا ایک پھول ہے اور چشمہ ان کا مصلا، چاند اور اس کی کرنیں

اس کی نماز میں نظر آتی ہیں۔ سہراب فطرت کی اشیا سے اتنا متاثر ہو چکا ہے کہ اسے ہر شے کے وجود میں خدا نظر آنے لگتا ہے۔

گاؤں کی سحر انگیز فضا نے مجید امجد کو بہت مجذوب کیا ہے اور وہ کسانوں، دہقانوں اور گاؤں میں رہنے والوں پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ گاؤں کی فضا میں جو خاموشی اور سادگی مجید امجد کو میسر ہوتی ہے وہ شہروں میں ہر انسان کو میسر نہیں ہوتی۔ ''بیساکھ''، ''کنواں''، ''دور کے پیڑ''، ''بن کی چڑیا''، ''کانٹے کلیاں''، ''ایک شام'' اور کئی دوسری نظموں میں مجید امجد اچھے انداز میں فطرت میں موجود مظاہر کی خوبصورت عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ ''بیساکھ'' کی نظم میں مجید امجد برصغیر پاک و ہند میں موجود ایک پرانی روایت کی تصویر کشی کرتا ہوا اپنا رشتہ ناتا ماضی سے جوڑ دیتا ہے۔ مجید امجد نہ صرف اپنے اردگرد کے ماحول اور فطرت کی ہر چیز پر باریک بین نظر ڈالتا ہے بلکہ وہ اپنی نظموں میں ٹھیٹھ ہندوستانی لفظوں کا بھی خوبصورت استعمال کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی بات سامنے آتی ہے کہ مجید امجد فطرت نگاری اپناتے وقت ہندوستانی سرزمین اور اس خطے کی روایت سے بخوبی واقف ہو کر مقامی الفاظ کو اپنی نظموں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کرنے لگتا ہے۔ جہاں سہراب سپہری اپنی نظموں میں فطرت کی ہر چیز کو اپنے وحدت الشہودی فلسفے کو بیان کرنے کے لیے استعمال میں لاتا ہے وہاں مجید امجد فطرت کی حقیقی دنیا پر نظر ڈالتے ہوئے ہر شے سے ایک زمینی رشتہ قائم کرنے کی تگ و دو میں رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ سہراب فطرت کو ایک مافوق الفطرت اور مابعدالطبیعیاتی دنیا بنانے کی سوچ میں لگا رہتا ہے حال آں کہ مجید امجد کو فطرت کے دامن میں رہ کر زمینی حقائق بیان کرنے کی ہر وقت فکر رہتی ہے۔ یہاں نظم ''بیساکھ'' کے چند مصرعے بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں جہاں مجید امجد اپنے گرد و پیش کے ماحول پر ایک فطری اور زمینی نظر ڈالتی ہوئی نظر آتا ہے:

بیساکھ آیا، آئی فسوں زائیوں کی رُت
آئی حسین کلیوں کی برنائیوں کی رُت!
گاؤں کے مرد و زن نے اٹھائیں درانتیاں
آئی سنہری کھیتوں کی لائیوں کی رُت
گندم کی فصل کاٹنے کے خوشگوار دن
محنت کشوں کی زمزمہ پیرائیوں کی رُت [۲۷]

یہاں ہم دیکھتے ہیں مجید امجد نے بیساکھ کے موسم کی جو تصویر پیش کی ہے اس میں زیادہ تر حقیقی فضا کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ مجید امجد کو ہر اس زمینی شے سے محبت ہے جو اس کے اردگرد کے ماحول کو خوبصورت بناتی ہے اور یہ خوبصورتی اس کے ہاں ایک ارضی اور فطری حقیقت کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ مجید امجد کبھی ''گھٹا'' سے مخاطب ہو کر اپنے دکھ درد کا گلہ شکوہ اس سے کرتا ہے اور اپنے دکھوں اور زندگی کی ناہمواریوں کی کہانی گھٹا کو سناتا ہے:

یہ نزہتیں مری محفل سے اے گھٹا لے جا

یہ اپنی بجلیوں کے ارغنون اٹھا لے جا
میں سن چکا ہوں بہت تیری داستانیں، بس
خموش! مجھ کو نہیں راس ترے نغموں کا رس [۸]

کتنی خوبصورتی سے شاعر " گھٹا" سے اپنے دکھ اور پریشانی کا قصہ سناتا ہے اور یوں اسے ایک طرح سے سکوں اور راحت ملتی ہے۔ جب انسان پر مشکلات کا وقت آتا ہے وہ اپنے درد دکھ دوسرے انسانوں کو سنانے بیٹھتا ہے۔ مجید امجد کا ایک خاص رویہ یہ ہے کہ وہ فطرت کے دامن میں رہتے ہوئے اپنے دکھوں کو زائل کرنے اور اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے بادلوں اور گھٹاؤں سے اپنے دل کی کہانی سناتا ہے اور یوں اسے سکوں ملتا ہے۔

مجید امجد فطرت کے دامن میں رہتے ہوئے اس سے متعلق متعدد لفظوں اور تراکیب سے بھی بخوبی واقف ہے۔موسموں، پھولوں، پرندوں،فصلوں کی رنگارنگی کو بڑے اچھے انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتا ہے۔ گو اس کے ہاں لفظوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جو موقع وحل کی مناسبت سے استعمال کرتا ہے۔

سپہری کی شاعری میں سہل ممتنع کی کیفیت ہمیں دکھائی دیتی ہے یعنی وہ ظاہری طور پر سادہ تراکیب و الفاظ استعمال میں لاتا ہے لیکن جملوں کی بندش اور ان کے بین السطور سے ہمیں ایک خاص فلسفے کا سراغ ملتا ہے جو فطری اور زمینی تلازمات بروئے کار لاتے ہوئے مافوق الفطری افکار اور خیالات بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ دیکھنے میں یہ الفاظ ہمارے گرد وپیش کے ماحول سے منسلک اور مربوط ہیں لیکن اصل میں سہراب ایک مافوق الفطری دنیا میں کھو گیا ہے جو ہماری دسترس سے خارج ہے، نہ اسے چھو سکتے ہیں نہ اس کی تفہیم اتنی آسانی سے ہوتی ہے بلکہ اسے سمجھنے کے لیے غور وخوض کرنا پڑتا ہے۔ بدھ مت کے فلسفے سے متاثر سہراب ایک ان دیکھی اور عجیب دنیا کا متلاشی نظر آتا ہے۔ اس کی دنیا ہماری جانی پہچانی فطری دنیا سے الگ اور ہماری ذہنی اپج سے کہیں اوپر دکھائی دیتی ہے۔ اپنی معروف نظم " صدای پای آب" میں زندگی کی ایک فلسفیانہ تعریف یوں پیش کرتا ہے:

زندگی سوت قطاری است کہ درخواب پلی می پیچد
زندگی دیدن یک باغچہ از شیشہ مسدودہ واپیماست [۹]

اردو ترجمہ:

زندگی، ایک ریل گاڑی کا ہارن ہے جو ایک سرنگ میں گونجتا چلا جاتا ہے
زندگی، ایک باغیچے پر ہوائی جہاز کی بند کھڑکی سے ایک نگاہ ہے

سہراب کی نظم گوئی میں اس طرح کی مبہم کیفیت نظر آتی ہے جس کی تفہیم اتنی آسانی سے نہیں ہوتی بلکہ انسان ورطہء حیرت میں مبتلا نظر آتا ہے۔ سہراب ہر چند نظم گوئی کے لیے اپنے ارد گرد اور قدرتی ماحول سے الفاظ اور تراکیب تلاش کرتا ہے لیکن ایک پیچیدہ اور فلسفیانہ بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانے کی کوشش میں منہمک نظر آتا ہے۔ سہراب کی نظم گوئی میں کہیں کہیں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں وہ انسانی رویوں اور اخلاقی ناہمواریوں پر بڑی کاری ضرب لگاتا ہے:

من ندیدم دوصنوبر را با ہم دشمن
من ندیدم بیدی، سایہ اش را بفروشد بہ زمین
رایگان می بخشد، نارون شاخِ خود را بہ کلاغ ۱۰

اردو ترجمہ:
میں نے کبھی نہیں دیکھا دوصنوبروں کا آپس میں بیر رکھنا
میں نے کبھی نہیں دیکھا، بید اپنا سایہ زمین کو بیچ دے
مفت میں، نارون اپنی ٹہنی کوّے کو بخشا ہے

یہاں سہراب انسان کی فطرت اور طینت کا درختوں سے موازانہ کرتا ہے اور قدرتی ماحول میں موجود درختوں اور پرندوں کی آپس میں مانوسیت اور دوستی کی ایک اچھی مثال ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جہاں انسان دوسرے انسان کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا وہاں صنوبر، بید اور نارون اپنی ہر چیز مفت میں بخش دیتے ہیں اور ایک ایسا فطری نظام ہے جو پوری کائنات میں موجود ہے لیکن انسان ہمیشہ عدم برداشت کا مظاہرہ کرتا ہوا فطری نظام کا ستیاناس کر دیتا ہے۔ نہ صرف انسان اپنے منفی اخلاقی رویوں سے دوسروں کی زندگی چھین لیتا ہے بلکہ نوبت یہاں تک آتی ہے کہ وہ نظام کائنات کو اپنی خلاف ورزیوں کے ذریعے تباہی کے دہانے پر پہنچا دیتا ہے۔ آج کل زمینی حقائق سے روگردانی اور قدرتی ماحول کی ہر شے میں تبدیلی لانے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انسانی حیات پورے طور پر خطرے کی زد میں ہے۔

موجودہ دور میں جہاں پانی کی قلت ایک گھمبیر مسئلہ بن گیا ہے اور آنے والی انسانی نسلوں کے لیے ابھی سے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے، وہاں سہراب نے پانی کی اہمیت اور پاکی کو موضوع بنا کر ایک اچھی نظم "آب" کے نام سے تخلیق کی ہے جو اپنی جگہ بہت دلچسپ ہے۔۔

آب را گل نکنیم:
در فرودست انگار، کفتری می خورد آب
یا کہ در بیشہ دور، سیرِ ای پری می شوید
یا در آبادی، کوز ای پری می گردد
آب را گل نکنیم:
شاید این آب روان، می رود پای سپیداری، تا فروشوید اندوہ دلی
دست درویشی شاید، نان خشکیدفرو برد در آب ۱۱

اردو ترجمہ:
پانی کو گدلا نہ کریں
بہاؤ کی طرف شاید کوئی کبوتر پی رہا ہو پانی

یا کسی دور جنگل میں کوئی بلبل کا چوزہ پی رہا ہو
یا آبادی میں کوئی کوزہ بھرا جا رہا ہو
پانی کو گدلا نہ کریں
شاید یہ بہتا پانی، جا رہا ہو کسی سفیدے کی طرف تا کہ کسی کا غم دھو ڈالے
کسی درویش کا ہاتھ شاید سوکھی روٹی بھگو رہا ہو پانی میں [۱۲]

ن م راشد نے سہراب کی نظم ''آب'' کا منظوم اردو ترجمہ کیا اور جو کیفیت اور تاثر اصل فارسی نظم میں موجود ہے ٹھیک اسی طرح ہمیں اردو ترجمے میں دکھائی دیتی ہے۔ سہراب بڑی بے آلایشی اور نہایت نفاست کے ساتھ پانی کے وصف میں رطب اللسان ہے۔ سہراب کی سوچ بڑی حد تک فلسفیانہ انداز پیش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی اس نظم میں پانی، حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو چرند پرند اور انسان کو زندگی بخشتا ہے۔ سہراب کے اندیشے میں پانی نہ صرف عالم ہستی کی مخلوقات کے لیے حیات اور زندگی کا ایک اہم سرمایہ ہے بلکہ گاؤں میں رہنے والوں کی صفائی اور پاکی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ کبھی سہراب کو کسی نہر کے کنارے میں بیٹھ کر اپنے پاؤں نہر کے ٹھنڈے پانی میں بھگوتے ہوئے سرور اور سرمستی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ فطری ماحول سے وابستہ ہر چیز سہراب کی شاعری میں رس بس چکی ہے۔ وہ اپنے قدرتی ماحول سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے۔

سہراب کے مجموعہ کلام ہشت کتاب کی نظموں کے ہر بند پر نظر ڈالی جائے وہاں ہمیں قدرتی ماحول سے متعلق کوئی نہ کوئی چیز موجود ہے۔ فطری ماحول سے متعلق یہ عناصر سہراب کے ہاں کہیں استعارے کے طور پر اور کہیں حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مجید امجد حقیقی اور زمینی حقائق سے زیادہ قریب ہیں۔ مثال کے طور اس کی نظم " توسیع شہر " میں وہ لہلہاتے ہرے بھرے کھیتوں کے بک جانے اور سایہ دار درختوں کے چیر دیے جانے پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے قدرتی ماحول پر آل آدم کی کاری ضرب پر نہایت غم زدہ نظر آتے ہیں۔

اگر مجید امجد کی نگاہ سے دیکھا جائے تو انسان اپنے قدرتی ماحول کی ہر چیز کو نیست و نابود کر کے نئی نئی بستیاں آباد کرنے کے پیہم عمل میں مصروف ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارنے کی ضد کرتا رہتا ہے۔ نہ اسے اپنے مستقبل اور آنی والی نسلوں کے بارے میں کوئی اندیشہ ہے نہ اسے اپنے قدرتی ماحول کو مزید بہتر بنانے کے لیے کوئی حکمت عملی نظر آتی ہے۔ سب سائنسدان انسانی زندگی کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں حال آں کہ انسان اپنے قدرتی ماحول میں تبدیلی لانے کے درپے ہے۔ سائنسدان کرہ ارض کی بگڑی ہوئی انسانی زندگی سے مایوس ہو کر انسان کی حیات اور بقا کو عالم ہستی کے دوسرے سیاروں میں تلاش کرنے لگے ہیں۔ کیا ان سیّاروں میں ہوا، پانی اور زندگی کی دوسری ضروریات موجود ہیں؟ خطرے کی گھنٹی تو بج گئی ہے اور مستقبل دور میں کہیں انسان کو اس کرہ خاکی سے ہجرت کر کے دوسرے کُرّات میں رہنا پڑے گا۔ مجید امجد قدرتی ماحول سے انسان کی نا انصافی اور بے رخی کو اپنی نظم میں لا کر اسے تنقید کا نشانہ بناتا ہے:

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار

جھومتے کھیتوں کی سرحد پر، بانکے پہرے دار
گھنے، سہانے، چھاؤں چھڑکتے، بُور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار

آج کھڑا میں سوچتا ہوں اس گاتی نہر کے دوار
اس مقتل میں صرف اک میری سوچ، لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک، اے آدم کی آل[۱۳]

یوں مجید امجد کی شاعری میں قدرتی ماحول سے محبت ہمیں واضح انداز میں نظر آتی ہے۔ وہ بیانیہ انداز اپنی نظم نگاری میں فطرت اور مخلوقات سے محو گفتگو ہے۔ اس طرح کی کیفیت سہراب کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے وہ بید، سرو، نارون، کوّے، چمگاڈر، سورج، پانی، بارش، روشنی، شبنم، گل سرخ، پہاڑ، پتھر، گھاس وغیرہ۔۔۔ سے ہمیشہ گفتگو کرتا رہتا ہے۔ وہ ایک خیالی اور ارمانی کیفیت سے گزرتا ہے اور ایک خیالی دنیا بسانے کی فکر میں رہتا ہے۔ وحدت الشہودی فکر و فلسفہ اس کے دل و دماغ میں ہر وقت سوار رہتا ہے۔ جب مجید امجد اپنی نظم "اے ری چڑیا" میں اپنے دل کا غم واندوہ ایک چڑیا کو سناتا ہے، مکالماتی انداز گفتگو پیدا ہوتی جو اس نظم کی خوبصورتی بڑھاتی ہے۔

یہ تو میرے دل کا پنجرا ہے، تو اس میں
اپنی ٹوٹی پھوٹی خوشیاں ڈھونڈنے آئی ہے؟
پگلی، یہاں تو ہے ہیرے کی کنی کا چوگا
اور اک زخمی سانس اس پنجرے کی انگنائی ہے![۱۴]

یہ مکالماتی انداز سہراب سپہری کی نظم گوئی میں بھی نظر آتا ہے جہاں وہ اپنی تنہائی میں ایک "مرغ معما" سے مخاطب ہو کر محو گفتگو رہتا ہے جو سہراب کی تنہائی سے اس کی ایک طرح سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ سہراب ایک مصور ہے جو ہمیشہ اپنی مصوری کے لیے قدرتی ماحول سے کینوس تلاش کر لیتا ہے۔ "مرغ معما" والی نظم میں سہراب کا مکالماتی انداز اور اس کی تنہائی کی کیفیت واضح طور پر سامنے آتی ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ سہراب سپہری: 1389، ص 15

۲۔ ن م راشد، جدید فارسی شاعری، 1987ء، ص 21

۳۔ (سہراب: 1389، ص 87-88)

۴۔ مجید امجد: 1988، ص 58

۵۔ س؟راب سپ؟ری: 1389، ص 267

۶۔ ایضاً، ص 268

۷۔ مجید امجد: 1988، ص85

۸۔ ایضاً، ص96

۹۔ سہراب سپہری: 1389، ص282

۱۰۔ ایضاً، ص 280

۱۱۔ ایضاً، ص 327

۱۲۔ ن۔م راشد: 1978، صص 186-187

۱۳۔ مجید امجد: 1988، ص 346

۱۴۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،